

Mashraqi Aurat

[’جب میری ماں کی دوسری شادی ہو رہی تھی میں بہت روئی تھی۔ گرچہ ، اس وقت میں چھوٹی سی تھی لیکن مجھے یاد تھا کہ میرے سگے والد کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک روز وہ اپنی زمینوں پر گئے تو کسی دشمن نے ان کو گولی مار دی اور وہ موقع پر ختم ہو گئے۔ میری ماں کا راج کٹ گیا اور میں یتیم ہو گئی۔ باپ زندہ ہو تو سبھی اس کی اولاد کا جانو کرتے ہیں، اب خاندان والے چاہ اور کرتے وہ مجھے منحوس کہتے ، پانچ برس کی عمر میں زمانے کی ٹھوکروں میں اگئی۔ سچ بے یتیم کا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ علی پور میں میرے باپ کی زمینیں تھیں مگر ان کے بعد سوتیلے چچا نے زمین پر قبضہ کر لیا۔ وہ اور ان کے سیوت ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جب ان لوگوں نے جینا دو بھر کر دیا تو خالہ نے ماں کی دوسری شادی اپنے دیور اللہ بخش کے ساتھ کرادی تاکہ گانوں والے ہم کو سکون سے رہنے دیں۔ جب میں نے پانچ جماعتیں پڑھ لیں تو ماں نے مزید پڑھانے کی بجائے مجھ کو گھر کے کاموں میں لگا دیا گیا۔ بد قسمتی سے جس شخص کے ساتھ ماں کی دوسری شادی ہوئی، وہ مستقل مزاج نہ تھا۔ کبھی کماتا اور کبھی دنوں بیکار گھر میں بیٹھ رہتا۔ اس طرح گزارہ مشکل ہو گیا اور گھر کا سکون بھی مالی پریشانی کے سبب جاتارہا۔ روز کے فاقوں سے تنگ آکر ماں، مجھے لے کر ماموں کے پاس ان کے گانوں چلی گئیں۔ ان دنوں ان کی دوسری بیٹی جس کا نام تو صاحب بی بی تھا، ماں پیار سے صہبا بلاتی تھی، اسے بخشو ابا کے پاس ہی چھوڑ دیا کیونکہ یہ میرے سوتیلے ابا کی بیٹی تھی۔ ماموں کے گھر ہم کو کسی نے بے سکون نہیں کیا۔ دو وقت کی روٹی بھی مل جاتی تھی لیکن صہبا بہت یاد آتی تھی۔ بخشو ابا کے گھر، میں ہی اس کو سنبھالتی تھی۔ صہبا نے ابا کو بہت تنگ کیا اور رو رو کر بیمار پڑ گئی، تبھی ابا(xa0) نے ہم کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی بالآخر ہمارا سراغ پالیا(xa0) ابا(xa0) نے میری امی سے بہت معافیاں مانگیں اور وعدہ کیا کہ اب وہ ضرور کوئی نہ کوئی کام کریں گے اور گھر میں بیکار نہیں بیٹھیں گے۔ ابا بخشو کوئی کام نہ جانتے تھے پڑھے لکھے بھی نہ تھے ، مجبوراً انہوں نے تانگہ چلانا شروع کر دیا اور میں ایک تانگے والے کی بیٹی کہلانے لگی حالانکہ میرے حقیقی والد زمیندار تھے اور میری ماں نے ان کے گھر زمینداری کا عیش دیکھا تھا لیکن اب تو ہمارے بُرے دن آچکے تھے۔ ایک دن صہبا بہت رو رہی تھی۔ امی جان نے مجھے کہا۔ زارا ! تم ذرا اسے چپ کروا دو۔ میں نے بہلایا ٹھلایا، جھولایا مگر وہ کسی طرح چپ نہ ہوئی۔ میں بھی بچی تھی، اسے چارپائی پر بٹک دیا۔ اُن دنوں میری عمر گیارہ برس تھی۔ آج کل اتنی عمر کی لڑکیاں باشعور ہوتی ہیں لیکن ہمارے زمانے میں بچے سادہ و معصوم ہوتے تھے۔ مجھے بھی اتنی سمجھ نہ تھی۔ ماں نے بُرا بہلا کہا اور دوبارہ حکم دیا کہ منی کو اٹھائو اور چپ کرانو لیکن میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی ، اس پر ماں مجھے بد دعائیں دینے لگیں اور گھر سے باہر دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ شام ہو رہی تھی۔ امی کو اتنا غصہ تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا۔ مجھ کو کتوں سے ڈر لگتا تھا۔ بہت دستک دی مگر امی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے یقین کر لیا کہ اب ساری رات باہر ہی گزارنی ہے۔ یہ سوچ کر بخشو ابا کے تانگے ہی میں چھپ گئی اور روتے روتے سو گئی۔ جہاں ہم رہتے تھے اس گلی کے بہت سے لڑکے ٹیوشن پڑھنے جاتے تھے۔ شام کو جب وہ ٹیوشن پڑھ کر گھر وں کو لوٹے انہوں نے دیکھا کہ ایک بچی تانگے میں سو رہی ہے اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک لڑکا حمزہ تھا۔ وہ ایک بڑے زمیندار کا بیٹا اور امیر خاندان سے تھا۔ حمزہ نے جب مجھے بے خودی کے عالم میں تانگے میں پڑا دیکھا تو اسے ترس آیا۔ اس نے مجھے جگایا اور کہنے لگا۔ زارا اٹھو، گھر جانو ، شاید تم کھلتے کھلتے تانگے میں سو گئی تھیں۔ میں اٹھ نہیں رہی تھی۔ اٹھو بھی زارا ! اس نے مجھ کو جھنجھوڑا۔ رات کا وقت ہے۔ تمہارے ماں باپ پریشان ہوں گے۔ میں جاگی تو یاد آیا ماں نے دھکا دے کر مجھے گھر سے نکالا تھا تبھی پریشان ہو گئی اور رونے لگی۔ حمزہ نے پوچھا۔ کیا تمہاری ماں نے مارا ہے ؟ اچھا او، میرے گھر چلو، میری ماں تمہیں گھر میں چھوڑ آئیں گی۔ میں اپنے گھر جانے کی بجائے اس کے ساتھ چلی گئی جہاں حمزہ کی ماں اور بہنوں نے دیکھتے ہی کہا۔ ارے یہ تو بخشو تانگے والے کی بیٹی ہے ، بچارے غریب لوگ ہیں۔ جانے ، کہاں سے یہ خانہ بدوشوں کی طرح آگئے ہیں اور کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا نازک سادل تو پہلے ہی زخمی تھا، یہ الفاظ سنتے ہی چھلنی ہو گیا۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دینے تو ان کے دلوں پر میری مظلومیت کا بہت اثر ہوا۔ حمزہ اور اس کی ماں میرے ساتھ گھر آئے اور امی کے حوالے کیا۔ حمزہ کی ماں نے امی کو ہدایت بھی کی کہ آئندہ اس بچی کو مارنا اور نہ ہی شام کے وقت گھر سے نکالنا۔ لڑکی ذات ہے۔ اس طرح بچیاں بُرے حادثے کا شکار بھی ہو سکتی ہیں لیکن میری ماں کو کب اتنی سمجھ تھی۔ وہ پڑھی لکھی تو تھیں نہیں ، حالات کی چکی کا ایندھن بنی ہوئی تھیں لہذا اپنی بیٹیوں سے بھی تنگ تھیں۔ ان دنوں ماں بہت چڑچڑی ہو گئی تھیں اور میں ان کے سلوک سے ڈکھی رہتی تھی۔ اب مجھے ایک پل گھر میں چین نہ تھا، اکیلے میں گھبراتی، جب ماں سبزی توڑنے کھیتوں میں جاتی اور ابا تانگہ لے کر نکل جاتے تو میں صہبا کو لے کر حمزہ کے گھر آجاتی۔ حمزہ کی بہنیں آمنہ اور انمہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں اور حمزہ تو اس قدر پیار سے پیش آتا کہ میں خود کو کوئی شے سمجھنے لگی تھی۔ ان لوگوں کے گھر میں نہ صرف مجھے سکون ملتا بلکہ میری صحت بھی اچھی ہو گئی۔ مالکہ جان جو حمزہ کی امی تھیں، میرا بہت ساتھ دیتی تھیں۔ مجھے کھانا کھلاتیں اور منی کو نہلا کے کپڑے بدلاتیں، اسے دودھ دیتیں اور چار پائی سے جھولنا باندھ کر سلا دیتیں۔ انہوں نے مجھے گھر کا کام سلیقے سے کرنا اور کڑھائی سلائی سکھائی۔ میں ان کے ساتھ رہ کر بہت خوش تھی۔ میری زندگی ہی بدل گئی تھی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی مجھے چاہتا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح خوشیاں پھر مجھے دھوکا دے گئیں۔ ماں کو جب پتا چلا کہ یہ لوگ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میں ان کی محبت میں کھو گئی ہوں تو وہ مجھے لے کر ماموں کے گانوں سے جہاں ہم اب رہ رہے تھے، ابا بخشو والے شہر یعنی اپنے سرسالی گھر کو لوٹ آئیں۔ یہاں واپس آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے منع کرتی تھیں کہ میں حمزہ کے گھر نہ جایا کروں، ان کے گھر کا کھانا بھی نہ کھایا کروں بلکہ اپنے گھر رہا کروں مگر میں نہ مانتی تھی کیونکہ اکیلے گھر میں رہنے کی وجہ سے میرا جی گھبراتا تھا۔ اماں جونہی گھر سے نکلتیں میں حمزہ کے یہاں چلی جاتی اور ان کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے لوٹ آتی۔ ابا مجھ کو منع نہیں کرتے تھے۔ کہتے ، ٹھیک ہے ان کے گھر جایا کرو، اکیلے رہنے سے انسانوں میں رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اماں کا خیال تھا کہ یہ لوگ مجھے بہکا دیں گے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ وہ ان لوگوں کے احسان تلے دب کر جینا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔ محنت مزدوری بھی اسی لئے کرتی تھیں کہ محنت مزدوری کرنا ان کی مجبوری تھی، ابا اتنا نہیں کماتے تھے کہ گزارہ صحیح طرح سے ہوتا۔ جب میں امی کے ساتھ ابا بخشو کے آبائی گھر آگئی تو میرا برا حال ہوا۔ حمزہ اور اس کے گھر والوں کو

یاد کرتی اور چھپ چھپ کر روتی۔ ایسے ہی دو سال گزر گئے لیکن ان لوگوں کی یاد میرے دل سے نہ نکل سکی۔ ماں میرے حال سے غافل نہ تھیں تاہم انہوں نے میری اداسی کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ ان کو تو اپنے کام کاج اور میری پرورش کی فکر تھی۔ میرا ہی ایسا حال نہ تھا حمزہ بھی میری خاطر پریشان تھا۔ وہ اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ اپنی پڑھائی چھوڑ دی جبکہ اس کے والد اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ جب باپ نے دیکھا، بیٹا پڑھائی سے غفلت برت رہا ہے تو ایک بڑے شہر پڑھنے بھیج دیا اور وہاں ہاسٹل میں داخل کرا دیا۔ حمزہ کا دل وہاں بھی نہ لگا۔ وہ ان دنوں ایف ایس سی کر رہا تھا۔ ایک دن وہ اس شہر آگیا جہاں ہم رہتے تھے۔ یہاں اس نے ایک اسٹور پر ملازمت کر لی۔ یہ خبر ابا\xa0 نے مجھے دی اس وقت امی گھر پر موجود نہ تھیں۔ میں بہت خوش ہوئی اور کچھ نہ کچھ خریدنے کے بھانے اسٹور پر جانے لگی۔ ابا بھی اسٹور پر جاتے تھے، حمزہ ان سے اچھی طرح ملتا تھا اور اپنی طرف سے کچھ اشیا اور راشن وغیرہ دے دیا کرتا تھا۔ رقم بھی ان چیزوں کی اسٹور کے مالک کو خود ادا کر دیتا۔ ابا\xa0 بخشو کی آمدنی کم تھی، چوری چھپے نشہ بھی کرنے لگے تھے۔ ان کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ میرے اسٹور پر جانے پر بالکل بھی معترض نہ تھے بلکہ اماں کو بھی نہ بتاتے کہ میں حمزہ سے ملتی ہوں اور باتیں کرتی ہوں۔ یہ بات کب تک چھپ سکتی تھی؟ ماں کو پتا چلا تو انہوں نے طوفان اٹھا دیا۔ اسٹور کے مالک سے جا کر شکوہ کیا۔ اس نے حمزہ کو سمجھا بجھا کر اس کے گھر بھجوا دیا۔ وہ جب گھر گیا تو خوفزدہ اور غم زدہ تھا۔ بیٹے کو غم زدہ دیکھ باپ نے بجانے ڈانٹ ڈپٹ کے اس کی دلجوئی کی اور شرط رکھی کہ اگر وہ دل لگا کر پڑھے گا تو وہ اس کے لئے میرا رشتہ مانگ لیں گے۔ یہ بھی ان کی شرط تھی کہ وہ ایف ایس سی میں اچھے نمبر لائے گا۔ حمزہ نے وعدہ کر لیا جی لگا کر محنت کی اور میرٹ بنالیا۔ سچ کہتے ہیں کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ اس نے اسی طاقت سے کام لیا اور شاندار رزلٹ دیا تو اس کے والد اپنی شرط اور وعدے سے مجبور ہو گئے اور وہ اپنی بیوی کے ہمراہ ہمارے گھر حمزہ کے لئے میرا رشتہ طلب کیا حالانکہ فی زمانہ ایسا نہیں ہوتا، لوگ مجھے نانگے والے کی لڑکی کہتے تھے جبکہ میرا حقیقی باپ تو زمیندار تھا لیکن قسمت نے مجھے بے اسرا اور یتیم کر دیا تھا۔ بہر حال وہ بڑے لوگ اور اچھے خاندان سے تھے، جبکہ میں ایک نانگے والے کی بیٹی کہلاتی تھی۔ ماں کو تو اس رشتے پر خوش ہونا چاہئے تھا لیکن وہ میرے سوتیلے چچا کے روئے اور ناناصافی سے ڈسی ہوئی تھیں۔ ان کو زمیندار طبقے سے بی خوف آتا تھا، لہذا خوش ہونے کی بجائے انہوں نے نفرت کا اظہار کیا اور حمزہ کے والدین کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ افسردہ ہو کر چلے گئے، میں بھی روتی سسکتی رہ گئی۔ جانے میری ماں کے جی میں کیا تھی۔ شاید وہ میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کرنے کی آرزو مند تھیں، تاہم یہ لوگ شہر میں رہتے تھے اور ہمیں پوچھنے تک نہ تھے۔ کبھی کبھار میری ماں خود اپنے مغرور بھائی اور بھابی سے ملنے چلی جاتی تھیں۔ حمزہ کے والدین تو اس انکار پر خاموش ہو بیٹھے مگر حمزہ کا چین قرار لٹ گیا۔ اس کی اب بھی یہی آرزو تھی کہ کسی طرح میں اسے مل جاؤں۔ ایک دن وہ مجھ سے ملا اور کہا کہ تمہاری ماں نے تو انکار کر دیا ہے۔ وہ کسی طرح مانتی نہیں، کیوں نہ تم میرے ساتھ میرے گھر آجاؤ، وہاں ہم شادی کر لیں گے۔ یہ سن کر میں خوفزدہ ہو گئی اور اسے جواب دیا۔ حمزہ، بے شک میری ماں ظالم سہی، میں، مگر اپنے غریب والدین کے چہرے پر یہ کالک نہیں مل سکتی کہ گھر سے بھاگ جاؤں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی تم مجھے بھول جاؤ۔ میں تمہارے ابا کو منالوں گا۔ اس نے کہا۔ ابا تو راضی ہے لیکن ماں بھی کوئی ہستی ہے۔ میں ان کی بددعائیں نہ لوں گی اور تم جانتے ہو کہ یہ نانگے والا میرا سوتیلہ باپ ہے۔ میرے حقیقی والد تو فوت ہو چکے ہیں میں ان کی روح کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ میں ایسا کہتے ہوئے بہت رور ہی تھی۔ اس نے بڑی منتیں کیں، وہ گاڑی لایا تھا جو سڑک کے پار کھڑی تھی لیکن میں نہ مانی، جس کے باعث وہ بہت غم زدہ ہوا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ یہ اچھے خاندان کی بیٹی ہے، اچھے خاندان میں آجائے مگر میری حمیت نے گھر سے بھاگنے کو گوارا نہ کیا۔ میں اپنے غریب ماں باپ کی عزت کی خاطر اپنی زندگی کو دائو پر لگا رہی تھی۔ وہ دور ہی ایسا تھا، جب لڑکی اور لڑکا خاموشی سے اپنے بزرگوں کے فیصلوں کے سامنے سر جھکا دیتے تھے اور ان کو اتنا بھی اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ ان فیصلوں کے خلاف احتجاج کر سکیں۔ حمزہ چلا گیا اور میرا سکون بھی ساتھ لے گیا۔ اب مجھے کسی پل قرار نہ تھا۔ روتی تھی مگر ماں کو پتا نہ چلے میں روئی ہوں۔ ان دنوں اپنے جینے مرنے کا ہوش نہیں تھا۔ تبھی ایک دن ابا نے کہا۔ زارا تم بہت اداس رہتی ہو۔ ذرا نبا دھو کر تیار ہو جاؤ تو میں تم کو تمہارے ماموں کے گاہوں سیر کرانے لے چلوں۔ وہاں تمہاری خالہ رہتی ہیں، ان کی بچیوں سے ملو گی، ماموں کے گھر جاؤ گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ اماں وہاں جانے سے منع کر دیں گی۔ میں نے جواب دیا۔ تم ان کو وہاں کا مت بتانا۔ قریب کے گاؤں میری بہن بھی تو رہتی ہے، اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں کہوں گا تم کو وہاں لئے جا رہا ہوں تو وہ منع نہیں کرے گی بلکہ ان کو کچھ بتانا ہی نہیں ہے۔ واپس آکر بتا دیں گے۔ وہ کھیتوں میں کام کر رہی ہے ابھی نکل چلو۔ شام سے پہلے ہم لوٹ آئیں گے۔ میں بھی اداسی سے تنگ اور اپنے ماحول سے خفا تھی۔ ماں تو ان دنوں مجھے اپنی دشمن نظر آتی تھی۔ میں ابا کی باتوں میں آگئی اور ماں کے جانے کے بعد منی کو پڑوسن کو تمہارا ابا کے ہمراہ نانگے پر بیٹھ کر سیر کو چل دی۔ ابا مجھے شادی میں لے جانے کے بجائے کہیں اور لے گیا۔ یہ ایک گاؤں تھا۔ بڑا سا پختہ مکان تھا۔ ارد گرد آبادی تھی۔ کسی کھاتے بیٹے شخص کا ڈیرہ تھا۔ اس کی بیوی اور تین بیٹیاں تھیں لیکن بیٹا نہیں تھا۔ وہ ہم لوگوں کو گھر میں لے گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے شوہر کی ہدایت پر انہوں نے ہماری مہمان نوازی کی اور عمدہ کھانا کھلایا۔ ابا نے کہا تم تھوڑی دیر یہاں رہو، میں ابھی آتا ہوں، پھر تمہارے ماموں کے گاہوں چلیں گے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ ابا مجھے اس آدمی کے ہاتھ بیچ کر چلا گیا ہے تو مجھے یقین نہ آیا۔ اس گھر کی عورت بولی۔ میرا خاوند کہتا ہے کہ گھر میں کام کاج کے لئے خریدا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ اس نے تم سے نکاح کرنے کے لئے تمہیں خریدا ہے کیونکہ میری تین بیٹیاں ہیں، بیٹا نہیں ہے۔ اس کی بیوی نے سچ کہا تھا۔ اس نے مجھ سے زبردستی نکاح کیا۔ میں بھی اب ماں کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کی ضد کی خاطر مجھے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ ابا مجھے بیچ کر چلا گیا ہے تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی مگر اب رونے دھونے چبھنے چلانے کا وقت گزر چکا تھا۔ جس شخص نے نکاح نامے پر میرے دستخط لئے اس نے بتایا کہ تمہارے والد پر بہت قرضہ چڑھ گیا تھا۔ قرض دار اس کو دھمکیاں دیتے تھے تبھی وہ تم کو بیچ گیا ہے۔ اب وہ تمہاری ماں کو جا کر یہی بتائے گا کہ تم کسی کے ساتھ چلی گئی ہو۔ تم کو اب یہیں رہنا ہے مگر میں اور میری بیوی تم کو عزت سے رکھیں گے بشرطیکہ تم جھگڑا نہ کرو اور ہمارے ساتھ صلح و سکون سے رہو۔ تم کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اب میں جاتی تو کہاں؟ میں تو ان لوگوں کی قید میں تھی۔ ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کر سکتی

جانا نہ چاہتی تھی۔ تھی۔ جانے ابا نے میری ماں کو میرے بارے کیا کہا، جانے ماں پر کیا گزری، مجھے خبر نہ تھی، میں ماں اور باپ اب میرے لئے بے معنی تھے۔ سوتن سمجھ دار تھی۔ وہ اپنے شوہر کی فرمانبردار تھی اور اس کی لڑکیاں بھی، انہوں نے مجھے پیار دیا، سوتن نے بڑی بہن کی طرح خیال رکھا۔ اس کی لڑکیاں میرے آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں ہم کو تو بس بھائی چاہئے کیونکہ ہماری ماں کسی آپریشن کے سبب بچے کو جنم نہیں دے سکتی۔ ہم چاہتی ہیں کہ ہمارا کوئی بھائی اور وارث ہو۔ ابا نے ہی ایک دن حمزہ کو بتایا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ بے چارہ تو یہ سن کر بوکھلا ہی گیا کہ میں ایک ادھیڑ عمر اور دل کے مریض شخص کی ملکیت ہو چکی ہوں۔ اسے یقین نہ آتا تھا، وہ x(a0 گانوں کے کچھ معزز لوگوں کو اکٹھا کر کے میرے خاوند کے ڈیرے پر آیا لیکن جب اسے پتا چلا کہ میں اس کی منکوحہ ہو چکی ہوں تو وہ واپس چلا گیا۔ میں ادھر روئی اور پچھتاتی تھی۔ اے کاش! حمزہ کے ساتھ ہی بھاگ کر اس کے گھر چلی جاتی تو میری اس کے ساتھ شادی ہو جاتی، جس سونیلے باپ کی لاج رکھی اس نے کیا کیا۔ حمزہ کی ڈیرے پر آمد کے بعد میرا شوہر بہت شکی مزاج ہو گیا۔ پہلی بیوی سے کہتا اس پر کڑی نظر رکھو مگر وہ عورت اعلیٰ مزاج کی تھی۔ مجھے کچھ نہ کہتی۔ میرا جی گھبرا اُٹا تو محلے میں اپنے ملنے والوں کے گھروں میں بھی لے جاتی تاکہ میرا جی بہلا رہے۔ وہ کہتی، یہ بھی بیچاری انسان ہے، کسی کی بچی ہے، اس پر ظلم کرنا ٹھیک نہیں۔ وہ شوہر کو سمجھاتی کہ یہ اچھی لڑکی ہے، نیک دل ہے، اس پر کبھی شک مت کرنا۔ ہمارے اس محلے میں حمزہ کی ایک کزن دلشاد بھی رہتی تھی۔ حمزہ نے اپنی داستان غم اسے سنائی، اس نے اگر مجھے بتایا کہ حمزہ تم سے ملنے آیا ہے۔ وہ بہانے سے مجھے اپنے گھر لے گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ رو پڑا، میں بھی رونے لگی۔ جب میں نے بتایا کہ سونیلے باپ نے مجھے بیچا ہے تو وہ یہ سن کر پاگل سا ہو گیا اور اپنے بال نوچنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے یہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا کہ تمہارے ساتھ زبردستی میں دھوکا ہوا ہے۔ یہ شادی درست نہیں۔ ہم عدالت سے رجوع کریں گے۔ جب اس نے یہ بات کہی تو میں گہری سوچ میں ٹوب گئی۔ جب میری ماں کی دوسری شادی ہو رہی تھی اور میں اپنے حقیقی باپ کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ کس سوچ میں کم ہو گئی ہو، جواب کیوں نہیں دیتی؟ حمزہ نے مجھے جھنجھوڑا مگر میں خاموش تھی۔ میں امید سے تھی، اس کو کیسے کہہ دیتی کہ تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میرے اور حمزہ کے بہت سے خواب تھے مگر اب کچھ امیدیں میں نے اپنے ہونے والے بچے سے وابستہ کر لی تھیں۔ حمزہ مجھ سے لاکھ محبت کرتا لیکن وہ کسی اور کے بچے سے تو وہ پیار نہیں کر سکتا تھا جو کوئی سگا باپ اپنے بچے سے کر سکتا ہے۔ تبھی میں نے یہ جانا کہ ایک شادی شدہ اور بچے والی عورت شوہر کے گھر سے بھاگے تو ساری زندگی، زمانہ اسے بھاگی ہوئی عورت ہی کہے گا اور یہ بات ان کی اولاد کے لئے ایک طعنہ بن جائے گی۔ اب جو کچھ خدا نے مقدر میں لکھ دیا تھا، مجھے مل گیا تھا۔ یہی سوچ کر حمزہ سے کہا کہ مجھے عدالت تک مت لے جانو۔ میں اب تمہارے ساتھ جانے کے لائق نہیں ہوں۔ یہ سن کر اس کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ بددل ہو کر چلا گیا۔ اس کے والد نے سمجھا بجھا کر اسے پڑھنے کے لئے لاہور بھجوا دیا۔ وقت گزرتا رہا، میں نے نئے حالات سے رفتہ رفتہ سمجھوتہ کر لیا کیونکہ اب ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ میرے شوہر کی قسمت میں ابھی لڑکا نہیں تھا سو اس بار میرے بطن سے بھی لڑکی نے جنم لیا اس کی چار بیٹیاں ہو گئیں۔ ایسے ہی بہت سے برس بیت گئے۔ حمزہ نے پڑھائی مکمل کر لی اور اعلیٰ تعلیم کی خاطر بیرون ملک چلا گیا۔ حمزہ کے جانے کا مجھے دکھ تھا چونکہ اس کی کزن دلشاد، سے اس کے بارے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وقت گہرے سے گہرے زخم بھی مندمل کر دیتا ہے اور شادی شدہ عورت تو پھر گہر داری اور بچوں کی گہما گہمی میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اسے بس اتنا ہی یاد رہ جاتا ہے کہ اس کا حسرتوں بھرا دل کبھی کسی کو چاہتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ گھر بسانے کے خواب دیکھے تھے۔ مرد مگر اپنی محبت کو شاید نہیں بھلا پاتے۔ اگر مرد کو کسی لڑکی کے ساتھ سچی محبت ہو جائے تو وہ خود مختار ہوتا ہے پھر شادی کرے یا نہ کرے حمزہ بھی شادی نہ کرتا چاہتا تھا لیکن اس کی والدہ نے رورو کر اس کی شادی کروادی۔ اس کی بیوی حسین و جمیل تھی مگر میری یاد اور میرا ذکر اس کی شریک حیات کی روح کو جلا دیتی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں نہ بن سکی اور ان کی طلاق ہو گئی۔ میری شادی کو پندرہ برس بیت چکے تھے۔ ایک دن اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو لے کر شہر کے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ یہ نیا ڈاکٹر بیرون ملک سے پڑھ کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھا تو چونک گئی، گھبرا کر نقاب ڈال لیا۔ باری اُنے پر بیٹی کو دکھایا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ بھی میری آواز سن کر کم صم تھا، میں ساری رات نہ سو سکی۔ اتنے سالوں بعد اسے دیکھا تو بیٹی کی بیماری بتانا ہی بھول گئی، اس نے اچھی طرح چپک اپ کیا۔ میرا خیال تھا وہ بھلا چکا ہے لیکن جونہی اٹھنے کو ہوئی اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور قدم تھم گئے۔ اس نے کہا۔ زارا تم چاہے جتنے نقاب اوڑھ لو، میں تم کو پہچان لوں گا۔ پہچان کی خوشبو کبھی نہیں مرتی، میں نے تمہاری موجودگی اسی وقت محسوس کر لی تھی۔ جب پہلے دن تم نے یہاں قدم رکھا تھا۔ اچانک جیسے وقت تھم گیا۔ چلتی ہوئی سونیاں رک گئیں۔ بس دونوں طرف خاموشی تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا، پتا ہی نہیں چلا۔ مدتوں بعد دو بچھڑے دوئے ملے تھے۔ آج بھی جیسے حمزہ کو میرا انتظار تھا۔ حمزہ کی شادی اس کے والد نے قسم دے کر کروائی تھی کیونکہ وہ بستر مرگ پر تھے۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھے۔ میری بھی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود اس کے دل کے دروازے میرے لئے کھلے ہوئے تھے۔ میں خود بھی چلتے چلتے تھک چکی تھی۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں سسرالی رشتہ داروں کے رحم و کرم پر جی رہی تھی کہ میرے تین بچے تھے، دکھوں کے بوجھ تلے دبی میں گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہی تھی۔ اپنی بیوی کو سنبھالے ہوئے بیٹیوں کی فکر سے گھلی جاتی تھی۔ میرے حالات جان کر آج پھر حمزہ نے کہا کہ تم کو میری ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا دیا ہے کہ اگر تم چاہو تو میں تم کو اور تمہارے بچوں کو اپنا سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ بچیاں ان کے چچا اور دادا مجھے نہیں دیں گے۔ میں کیسے اپنی بیٹیوں سے منہ موڑ سکتی ہوں؟ ان کے سروں پر باپ کا سایہ نہیں ہے، ماں بھی نہ رہے تو وہ کس حال میں جیتیں گی؟ اب جہاں ہوں، وہیں ٹھیک ہوں۔ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہوں اور تمہارا گھر بسا ہوا ہے، میں اس میں انتشار نہیں پھیلاتا چاہتی۔ ایک بار میں نے حمزہ کی محبت کو ٹھکرایا، ماں باپ کی عزت کی خاطر، دوسری مرتبہ اپنے شوہر کی عزت کی خاطر اور تیسری مرتبہ اپنی بیٹیوں کی خاطر جن کے مستقبل کو میں کسی حرکت یا اقدام سے طعنہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ میں اُلتے قدموں وہاں سے پلٹ آئی۔ گھر آکر دل کھول کے روئی تھی۔ کاش! وہ مجھے زندگی کے اس موڑ پر دوبارہ نہ ملتا۔ حمزہ کے خیال میں، میں بے وفا ہوں میں نے اس سے محبت ہی نہیں کی تھی۔ کیسے اسے بتاتی کہ ایک مشرقی عورت کی کیا محبوریاں ہوتی ہیں۔ کبھی ماں باپ کے لئے، کبھی شوہر اور اولاد کے لئے اسے سب کچھ قربان

کرنا پڑتا ہے۔!]